پوری دنیا میں پڑھائی جانیوالی کتاب

حُجَّةُ اللهِ البالِغة

ترجمہ اُردو

حصّہ اوّل، دوم

مصنف

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفیٰ - 1176ھ)

12-ویں صدی کے مُجدّدِ اعظم

مترجم

مولانا عبدالرحیم

سابق پروفیسر عربی و پشتو و ناظم مکتبہ علومِ شرقیہ اسلامیہ کالج پشاور

(Important Notes)

(آج کے مشہور اختلافات کا حل)

الفیصل ناشران و تاجرانِ کتب

اُردو بازار لاہور

روح اجتہاد کے مفقود ہو جانے پر شاہ صاحبؒ کی تنقید:

''رہی دوسری خرابی، اس کے متعلق شاہ صاحبؒ نے ازالۃ الخفا حجۃ اللہ البالغہ' البدور البازغہ' تفہیمات الٰہیہ' مسوے مصفے (شرح موطا میں) اور قریب قریب اپنی ہر ایک تصنیف میں اس پر ماتم کیا ہے۔ چنانچہ ازالۃ الخفا میں فرماتے ہیں: ''دولت شام یعنی سلطنت امویہ کے خاتمے تک کوئی اپنے آپ کو حنفی یا شافعی نہ کہتا تھا بلکہ سب اپنے اپنے آئمہ اور اساتذہ کے طریقہ پر دلائل شرعی سے استنباط کرتے تھے۔ دولت عراق یعنی سلطنت عباسیہ کے زمانے میں ہر ایک نے اپنا ایک نام معین کیا اور یہ کیفیت ہوگئی کہ جب تک اپنے مذہب کے بڑوں کی نقل نہ پاتے (جس میں انہوں نے اس مسئلہ کی تصریح کی ہوتی) کتاب و سنت (قرآن و حدیث) کی دلیل پر حکم نہ کرتے۔ اسطرح وہ اختلافات جو تاویل کتاب و سنت کی اقتضاء سے ناگزیر طور پر پیدا ہوئے تھے' مضبوط بنیادوں پر جم گئے۔ جب دولت عرب کا خاتمہ ہوگیا۔ (یعنی ترکوں کے اقتدار کا زمانہ آ گیا) اور لوگ مختلف ممالک میں منتشر ہوئے تو ہر ایک نے جو کچھ اپنے مذہب فقہی سے یاد کیا تھا اس کو اصل بنالیا۔ پہلے جو چیز مذہب سے مستنبط تھی۔ اب وہ سنت مستقرہ بن گئی اور ان کے علم کا مدار اس پر رہ گیا کہ تخریج پر تخریج کریں اور تفریع پر تفریع۔''

مصفے شرح موطا میں لکھتے ہیں: ''ہمارے زمانے کے سادہ لوح اجتہاد سے بالکل برگشتہ ہیں۔ اونٹ کی طرح ناک میں نکیل پڑی ہے اور یہ کچھ نہیں جانتے کہ کدھر جارہے ہیں۔ ان کا کاروبار ہی دوسرا ہے۔ بیچارے ان امور کی سمجھ بوجھ کے لیے مکلف ہی نہیں ہیں۔'' حجۃ اللہ البالغہ کے ساتویں مبحث میں اور انصاف فی بیان سبب الاختلاف میں شاہ صاحبؒ نے اس مرض (تقلید) کی پوری تاریخ بیان کی ہے اور ان خرابیوں کی نشاندہی کی ہے جو اس کی بدولت پیدا ہوئیں۔

حالات حاضرہ کا جائزہ۔ معقولین اور صوفیہ پر تبصرہ:

تاریخی تنقید کے بعد شاہ صاحبؒ اپنے زمانے کی حالت کا جائزہ لیتے ہیں اور ایک ایک گروہ کو نام بنام پکار کر اس کے نقائص بیان کرتے ہیں۔ تفہیمات میں ایک جگہ لکھتے ہیں: ''یہ وصی (یعنی خود شاہ صاحبؒ) ایسے زمانے میں پیدا ہوا جبکہ لوگوں میں تین چیزیں غلط ملط ہوگئی تھیں:

(1) طریق استدلال (کسی بات کی نفی یا اس کے اثبات کے لیے منظم طریقہ پر دلائل پیش کرنا) جو طریق استدلال مروج ہے۔ یہ یونانی علوم کے اختلاط کی بدولت ہے۔ لوگ کلامی مباحث میں مشغول ہوگئے ہیں۔ یہاں تک کہ عقاید میں کوئی گفتگو ایسی نہیں ہوتی جو مناظرہ کے رنگ سے خالی ہو۔

(2) وجدان پرستی اور یہ صوفیوں کے مقبول عام ہونے اور ان کی حلقہ بگوشی کی وجہ سے ہے' جس نے مشرق سے مغرب تک لوگوں کو گھیر رکھا ہے' یہاں تک کہ ان حضرات کے اقوال و احوال لوگوں کے دلوں پر کتاب و سنت (قرآن و حدیث) اور ہر چیز سے زیادہ تسلط رکھتے ہیں۔ ان کے رموز و اشارات (اصطلاحات صوفیہ) اس قدر دخل پاگئے ہیں کہ جو شخص ان رموز و اشارات کا انکار کرے یا ان سے خالی ہو (یعنی ان کا موقعہ بے موقعہ ذکر نہ کرے) وہ نہ مقبول ہوتا ہے۔ نہ صالحین میں شمار ہوتا ہے (شاہ صاحبؒ نے بہت ہلکے پھلکے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ شاید آپ کے عہد میں ایسا ہو۔ ہمارا تجربہ تو یہ ہے کہ کم از کم ان رموز و اشارات کے منکر کو کافر' منکر اولیاء اور راندہ درگاہ سمجھا

جاتا ہے) منبروں پر کوئی واعظ ایسا نہیں جس کی تقریر اشرات صوفیہ سے پاک ہو اور درس کی مسندوں پر کوئی عالم ایسا نہیں جو ان کے کلام میں اعتقاد اور غور و خوض کا اظہار نہ کرے۔ ورنہ اس کا شمار گدھوں میں ہونے لگتا ہے۔ پھر امراء اور روساٗ وغیرہ کی کوئی ایسی مجلس نہیں جہاں لطف کلام، بذلہ سنجی اور تفنن طبع کے لیے صوفیہ کے اشعار اور نکات و رموز کھلونہ بنے ہوں۔

(3) طاعت نفس و ہویٰ۔ اس زمانے کی ایک (لا علاج) بیماری یہ ہے کہ ہر ایک اپنی رائے پر چلتا ہے اور بگ ٹٹ چلا جارہا ہے۔ نہ متشابہات پر جاکر رکتا ہے (بلکہ دعویٰ کرتا ہے کہ متشابہات کا سرے سے وجود ہی نہیں اور لفظ متشابہات جو قرآن مجید میں آیا ہے۔ اس کی کوئی الٹی پلٹی توجیہہ کردیتا ہے) اور نہ کسی ایسے امر میں دخل دینے سے باز رہتا ہے جو اس کے علم سے بالاتر ہو۔ احکام کے معانی اور اسرار پر ہر ایک اپنی عقل سے کام کررہا ہے اور جو کچھ جس نے سمجھ لیا ہے اس پر دوسروں سے مناظرہ اور مباحثہ کررہا ہے (عصر حاضر کے یورپ زدوں کا کتنا صحیح خاکہ ہے) دوسری بیماری یہ ہے کہ فقہ میں حنفی شافعی (اور اہل حدیث) وغیرہ کے سخت اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ہر ایک اپنے طریقہ میں تعصب برتتا ہے اور دوسروں کے طریقہ پر اعتراض کرتا ہے۔ ہر ایک مذہب میں تخریجات کی کثرت ہے اور حق اس غبار میں چھپ گیا ہے۔

پیرزادوں سے آپ کا خطاب:

اسی کتاب میں ایک اور جگہ (جہاں وہ لوگوں کے مختلف طبقات سے الگ الگ خطاب کرتے ہیں) لکھتے ہیں:

''میں ان پیرزادوں سے جو بغیر کسی استحقاق کے باپ دادا کی گدیوں پر بیٹھتے ہیں۔ کہتا ہوں، کہ یہ کیا دھڑے بندیاں تم نے کر رکھی ہیں؟ کیوں تم میں سے ہر ایک اپنے طریقہ پر چل رہا ہے اور کیوں اس طریقہ کو سب نے چھوڑ رکھا ہے جس کو اللہ و تبارک تعالیٰ نے محمد رسول ﷺ پر اتارا تھا۔ تم میں سے ہر ایک مقتدر اور امام بن بیٹھا ہے، اپنی طرف لوگوں کو بلا رہا ہے اور اپنے آپ کو ہادی اور مہدی سمجھتا ہے حالانکہ وہ ضال اور مضل ہے، ہم ہرگز ان لوگوں سے راضی نہیں ہیں جو دنیا کے فوائد کی خاطر لوگوں سے بیعت لیتے ہیں یا اس لیے علم حاصل کرتے ہیں کہ اغراض دینوی ان کو حاصل ہوں۔ یا وہ لوگوں کو اپنی طرف دعوت دیتے ہیں اور اپنی خواہشات نفس کی ان سے اطاعت کراتے ہیں۔ یہ سب رہزن ہیں، دجال ہیں، کذاب ہیں۔ خود بھی دھوکے میں ہیں اور دوسروں کو بھی دھوکہ دے رہے ہیں۔''

علمائے وقت سے خطاب:

''میں ان سے کہتا ہوں جو اپنے آپ کو علماء کہتے ہیں کہ بے وقوفو! تم یونانیوں کے علوم اور صرف و نحو اور معانی (کی بھول بھلیوں) میں پھنس گئے اور سمجھے کہ علم اسی کا نام ہے حالانکہ علم تو کتاب اللہ کی آیت محکمہ ہے یا وہ سنت ہے جو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہو۔ تم پچھلے فقہاء کے استحسانات اور تفریعات میں ڈوب گئے۔ کیا تمہیں خبر نہیں کہ حکم صرف وہ ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ نے فرمایا۔ تم میں

سے اکثر لوگوں کا یہ حال ہے کہ جب کسی کو نبیؐ کی کوئی سچی حدیث پہنچتی ہے تو وہ اس پر عمل نہیں کرتا اور کہتا ہے کہ میرا مذہب فلاں مذہب پر ہے نہ کہ حدیث پر۔ پھر وہ حیلہ پیش کرتا ہے کہ صاحب! حدیث کا فہم اور اس کے مطابق فیصلہ (یعنی اس پر عمل کرنا) تو کاملین اور ماہرین کا کام ہے اور حدیث آئمہ سلف سے چھپی تو رہی نہ ہوگی۔ پھر کوئی وجہ تو ہوگی کہ انہوں نے اس کو ترک کردیا۔ جان رکھو کہ یہ ہرگز دین کا طریقہ نہیں۔ اگر تم اپنے نبی پر ایمان لائے ہو تو اس کا اتباع کرو۔ خواہ کسی مذہب کے موافق ہو یا مخالف۔''

واعظوں سے خطاب:

''میں ان متقشف (خشک طبع) واعظوں' عابدوں اور خانقاہ نشینوں سے کہتا ہوں کہ اے زہد کے مدعیو! تم ہر وادی میں بھٹکنے لگے اور ہر رطب و یابس کو لے بیٹھے۔ تم نے لوگوں کو موضوعات (من گھڑت حدیثوں) اور اباطیل کی طرف بلایا۔ تم نے خلق خدا پر زندگی کا دائرہ تنگ کردیا (دین کے یسر کو عسر سے بدل دیا) حالانکہ تم فراخی کے لیے مامور تھے۔ نہ کہ تنگی کے لیے۔ تم نے مغلوب الحال صوفیوں کی باتوں پر اپنے کلام کا انحصار کیا۔ (اس میں اناالحق اور ہمہ اوست وغیرہ شطحیات کی طرف اشارہ ہے) حالانکہ یہ باتیں پھیلانے کی نہیں لپیٹ کر رکھ دینے کی ہیں۔''

امراء سے خطاب:

''میں امراء سے کہتا ہوں کہ تمہیں خدا کا خوف نہیں آتا؟ تم فانی لذتوں کی طلب میں مستغرق ہوگئے اور رعیت کو چھوڑ دیا کہ ایک دوسرے کو کھا جائے۔ علانیہ شرابیں پی جارہی ہیں اور تم نہیں روکتے ہو۔ زناکاری' شراب خوری اور قمار بازی کے اڈے برسرعام بن گئے ہیں اور تم ان کا انسداد نہیں کرتے ہو۔ اس عظیم الشان ملک میں جس کو تم ضعیف پاتے ہو' اس کو کھا جاتے ہو اور جس کو قوی پاتے ہو' اس کو چھوڑ دیتے ہو۔ کھانوں کی لذت' عورتوں کے ناز و انداز' کپڑوں اور مکانوں کی زیبائش و آرائش بس یہی چیزیں ہیں جن میں تم ہر وقت منہمک رہتے ہو' کبھی خدائے بزرگ و برتر کا خیال تمہارے دل میں پیدا نہیں ہوتا۔''

سپاہیوں سے خطاب:

''میں ان سپاہیوں سے کہتا ہوں کہ تم کو اللہ تعالیٰ نے جہاد کے لیے' اعلائے کلمہ حق کے لیے' شرک اور اہل شرک کا زور توڑنے کے لیے بنایا تھا۔ تم نے اس کو چھوڑ کر گھوڑ سواری اور ہتھیار بندی کو ایک پیشہ بنالیا۔ اب جہاد کی نیت اور اس کے مقصد و ارادہ سے تمہارے دل خالی ہیں۔ پیسہ کمانے کے لیے سپہ گری کرتے ہو۔ بھنگ اور شراب پیتے ہو۔ داڑھیاں منڈواتے اور مونچھیں بڑھاتے ہو۔ بندگان خدا پر ظلم ڈھاتے ہو اور کبھی تمہیں اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ تم حرام کی روٹی کما رہے ہو یا حلال کی! خدا

کی قسم! تم کو ایک روز اس دنیا سے جانا ہے۔ پھر اللہ تبارک و تعالیٰ تمہیں قیامت کے دن بتائے گا کہ تم کیا کرکے آئے ہو۔"

اہل حرفہ سے خطاب:

"میں اہل حرفہ اور عوام سے کہتا ہوں کہ تم سے امانت اور دیانت رخصت ہو گئی ہے۔ اپنے رب تعالیٰ کی عبادت سے تم غافل ہو گئے ہو اور خدائے بزرگ و برتر کے ساتھ شرک کرنے لگے ہو۔ تم غیر اللہ کے لیے قربانیاں کرتے ہو اور مدار صاحب اور سالار صاحب کی قبروں کا حج کرتے ہو' یہ تمہارے بدترین افعال ہیں۔ تم میں سے جو کوئی خوشحال ہو جاتا ہے (ذرا پیسہ کما لیتا ہے) وہ اپنے لباس اور کھانے پر اتنا خرچ کرتا ہے کہ اس کی آمدنی اس کے لیے کافی نہیں ہوتی اور اہل و عیال کی حق تلفی کرنی پڑتی ہے یا پھر وہ شراب نوشی اور رنڈی بازی کرکے دنیا اور آخرت دونوں کو برباد کر دیتا ہے۔"

عام مسلمانوں سے خطاب:

"پھر میں مسلمانوں کی تمام جماعتوں کو عام خطاب کرکے کہتا ہوں کہ اے اولاد آدم! تم نے اپنے اخلاق کھو دیئے۔ تم پر سنگدلی چھا گئی اور شیطان تمہارا محافظ بن گیا۔ عورتیں مردوں پر حاوی ہو گئیں اور مردوں نے عورتوں کو ذلیل بنا رکھا ہے۔ حرام میں تمہیں مزہ آتا ہے اور حلال تمہارے لیے بدمزہ بن گیا ہے۔ اے اولاد آدم! تم نے ایسی فاسد (خراب اور بری) رسمیں اختیار کر لی ہیں جن سے دین متغیر ہو گیا ہے۔ مثلاً عاشورہ کے دن تم جمع ہو کر باطل حرکتیں کرتے ہو۔ ایک جماعت نے اس کو ماتم بنا رکھا ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ سب دن اللہ تعالیٰ کے ہیں اور سارے حوادث اللہ کی مشیت سے ہوتے ہیں۔ اگر حسینؓ اس روز شہید کیے گئے تو اور کون سا دن ہے جس میں کسی محبوب خدا (اور اس کے مقبول بندے) کی موت واقع نہ ہوئی ہو؟ پھر کچھ لوگوں نے اس کو کھیل تماشے کا دن بنا لیا ہے' بعض دوسروں نے اس کو مذہبی مناسک کا دن بنا رکھا ہے۔ تم شب برات میں جاہل قوموں کی طرح کھیل تماشے کرتے ہو اور تم میں سے ایک گروہ کا خیال ہے کہ اس روز مردوں کو کثرت سے کھانا بھیجنا چاہیے۔ اگر تم سچے ہو تو اپنے اس خیال اور ان حرکات کے لیے کوئی دلیل لاؤ۔ تم نے ایسی رسمیں بنا رکھی ہیں جن سے تمہاری زندگی تنگ ہو رہی ہے مثلاً شادیوں میں فضول خرچی' طلاق کو ممنوع بنا لینا' بیوہ کو بٹھائے رکھنا۔ اس قسم کی رسموں میں تم اپنے مال اور اپنی زندگیوں کو خراب کر رہے ہو اور (رسول خدا ﷺ کے) صالح طریقہ کو تم نے چھوڑ دیا ہے۔ حالانکہ بہتر یہ تھا کہ ان رسموں کو چھوڑ کر اس سنت صالحہ پر چلتے جس میں سہولت تھی نہ کہ تنگی۔ تم نے موت اور غمی کی تقریبات کو عید بنا رکھا ہے۔ گویا تم پر کسی نے فرض کر دیا ہے کہ جب کوئی مرے تو اس کے اقرباء کو خوب کھانا کھلائیں۔ تم نمازوں سے غافل ہو۔ کوئی اپنے کاروبار میں اتنا مشغول ہوتا ہے کہ نماز کے لیے وقت نہیں پاتا اور کوئی اپنی تفریحی خوش گپیوں میں اس قدر منہمک ہوتا ہے کہ نماز

کو فراموش کر دیتا ہے۔ تم از کوۃ سے بھی غافل ہو۔ تم میں کوئی ایسا مالدار نہیں جس کے ساتھ بہت سے کھانے والے لوگ لگے ہوئے نہ ہوں۔ وہ ان کو کھلاتا اور پہناتا ہے مگر زکوۃ اور عبادت کی نیت نہیں کرتا (اس نیت سے ہی کم از کم ادائے فرض کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جاتا) تم رمضان کے روزے بھی ضائع کرتے ہو اور اس کے لیے طرح طرح کے بہانے بناتے ہو۔ تم لوگ سخت بے تدبیر ہو گئے ہو (اقتصاد کا دھیان نہیں رکھتے۔) تم نے اپنے بسر اوقات کا انحصار سلاطین کے وظائف اور مناصب پر رکھا ہے اور جب تمہارا بار سنبھالنے کیلئے سلاطین کے خزانے کافی نہیں ہوتے تو وہ رعیت کو تنگ کرنے لگتے ہیں۔''

شرک کرنے والے مسلمانوں سے خطاب:

ایک اور جگہ تفہیمات میں فرماتے ہیں۔

''جو لوگ حاجتیں طلب کرنے کے لیے اجمیر یا سالار مسعود کی قبر پر یا ایسے ہی دوسرے مقامات پر جاتے ہیں وہ اتنا بڑا گناہ کرتے ہیں کہ قتل اور زنا کا گناہ اس سے کم تر ہے۔ آخر اس میں اور خود ساختہ معبودوں کی پرستش میں کیا فرق ہے؟ جو لوگ لات اور عزیٰ سے حاجتیں طلب کرتے تھے۔ ان لوگوں کا فعل ان لوگوں کے فعل سے آخر کس طرح مختلف تھا؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہم ان کے برعکس ان لوگوں کو صاف الفاظ میں کافر کہنے سے احتراز کرتے ہیں کیونکہ اس کے متعلق شارع کی نص (حکم صریح) موجود نہیں۔ مگر اصولاً ہر وہ شخص جو کسی مردہ کو زندہ ٹھہرا کر اس سے حاجتیں طلب کرتا ہے اس کا دل گناہ میں مبتلا ہے۔''

تفہیمات کا ایک اہم اقتباس:

یہ اقتباسات بہت طویل ہوگئے ہیں مگر تفہیمات جلد دوم کے چند فقرے اور تقاضا کر رہے ہیں کہ ان کو بھی ناظرین تک پہنچا دیا جائے فرماتے ہیں: ''نبی کریم ﷺ کی حدیث ہے کہ تم بھی آخر کار اپنے سے پہلے کی امتوں کے طریقے اختیار کر لو گے اور جہاں جہاں انہوں نے قدم رکھا ہے وہاں تم بھی قدم رکھو گے۔ حتیٰ کہ وہ کسی گوہ کے بل میں گھسے ہیں تو تم بھی ان کے پیچھے جاؤ گے۔ صحابہ نے پوچھا: یا رسول اللہؐ! پہلی امتوں سے آپ کی مراد یہود اور انصاریٰ ہیں؟ حضور نے فرمایا: اور کون؟ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔ سچ فرمایا اللہ تعالیٰ کے رسولؐ نے۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے وہ ضعیف الاعتقاد مسلمان دیکھے ہیں جنہوں نے صالحین کو ارباباً من دون اللہ بنا لیا ہے اور یہود و نصاریٰ کی طرح اولیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ ٹھہرا رکھا ہے۔ ہم نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو شارع کے کلام میں تحریف کرتے ہیں اور نبی کریم ﷺ کی طرف یہ قول زور (جھوٹی حدیث) منسوب کرتے ہیں کہ یہ نیک لوگ اللہ کے لیے ہیں اور گناہ گار میرے لیے۔ یہ اسی قسم کی بات ہے کہ یہودی کہتے تھے: لن تمسّنا النّارُ الّا ایّاماً مّعْدُوْدَۃً (سورۃ بقرہ۔ رکوع 9) ''ہم دوزخ میں نہیں جائیں گے اور گئے بھی تو بس چند روز کے لیے۔'' (کیا مسلمانوں کا یہ عقیدہ جس کا حضرت شاہ صاحبؒ نے بیان کیا ہے بعینہٖ عیسائیوں کے مسئلہ کفارت کی طرح نہیں؟) سچ پوچھو تو آج ہر گروہ میں دین کی تحریف پھیلی ہوئی ہے۔ صوفیہ کو دیکھو تو ان میں ایسے اقوال زبان زد ہیں جو

کتاب و سنت سے مطابقت نہیں رکھتے۔ خصوصاً مسئلہ توحید★ میں اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ شرع کی انہیں بالکل پروا نہیں۔ فقہاً کی فقہ کو دیکھو تو اس میں اکثر وہ باتیں ملتی ہیں جن کی مأخذ کا پتہ نہیں۔ مثلاً وہ دروہ کا مسئلہ اور کنوؤں کی طہارت کا مسئلہ وغیرہ (اس قسم کے سینکڑوں مسئلے جو نصوص صریحہ قرآن اور حدیث کے مخالف ہیں اور بایں ہمہ فقہاء کے مسلمات سے ہیں گنائے جاسکتے ہیں) رہے اصحاب معقولات (جن کو عام طور پر معقولیین کہتے ہیں) اور شعراء اور اصحاب ثروت اور عوام تو ان کی تحریفات کا ذکر کہاں تک کیا جائے (انہوں نے تو گویا اپنا ایک دین بنا رکھا ہے۔''

اس تنقید کا نتیجہ:

ان اقتباسات سے ایک دھندلا سا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شاہ صاحبؒ نے مسلمانوں کے ماضی اور حال کا کس قدر (گہرا مطالعہ اور) تفصیلی جائزہ لیا ہے اور پھر کسی قدر جامعیت کے ساتھ ان پر تنقید کی ہے۔ اس قسم کی تنقید کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سوسائٹی میں جتنے صالح عناصر موجود ہوتے ہیں جن کے ضمیر اور ایمان میں زندگی اور جن کے قلب میں بھلے اور برے کی تمیز ہوتی ہے ان کو حالات کی خرابی کا احساس سخت مضطرب کر دیتا ہے۔ ان کی اسلامی حس اتنی تیز ہوجاتی ہے کہ اپنے گردوپیش کی زندگی میں جاہلیت کا ہر ایک اثر ان کو کھٹکنے لگتا ہے۔ ان کی قوت امتیاز اتنی بڑھ جاتی ہے کہ وہ زندگی کے ہر پہلو میں اسلام اور جاہلیت کی آمیزشوں کو تحلیل کرنے لگتے ہیں اور ان کی قوت ایمان اس حد تک بیدار ہوجاتی ہے کہ خارزار جاہلیت کی ہر کھٹک انہیں اصلاح کے لیے بے چین کر دیتی ہے۔ اس کے بعد مجدد کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ ان کے سامنے تعمیر نو کا ایک نقشہ (ایک لائحہ عمل) واضح صورت میں پیش کرے۔ تا کہ حالت موجودہ کو جس حالت سے بدلنا مطلوب ہے۔ اس پر وہ اپنی نظر جما سکیں اور اپنی تمام سعی و عمل کا اسی کو مرکز قرار دیں۔ یہ تعمیری کام (یا یوں کہیے اس کا لائحہ عمل پیش کرنا) بھی شاہ صاحبؒ نے اس خوبی اور جامعیت کے ساتھ انجام دیا جو ان کے تنقیدی کام میں آپ دیکھ چکے ہیں۔

فقہ کے متعلق آپ کا معتدل مسلک:

تعمیر نو کے سلسلہ میں ان کا پہلا اہم کام یہ ہے کہ وہ فقہ میں (جس کا اثر عالم گیر تھا اور ہے) ایک نہایت معتدل مسلک پیش کرتے ہیں جس میں کسی ایک مذہب کی جانبداری اور اس کے مخالف مذاہب پر نکتہ چینی نہیں پائی جاتی۔ (وہ مذاہب کا محاکمہ کرتے ہیں اور ہر ایک کو اس کے افراط اور تفریط سے ہٹا کر دونوں کو نقطۂ عدل پر جمع کرنا چاہتے ہیں) ایک محقق کی طرح انہوں نے تمام مذاہب فقہیہ کے اصول اور طریق استنباط کا گہرا مطالعہ کیا اور بالکل آزادانہ رائے قائم کی ہے (جیسے کہ ایک جج کا فرض ہے) جس مذہب کی کسی مسئلہ میں تائید کی۔ وہ صرف اس بنا پر کہ دلیل اس کے حق میں تھی۔ نہ اس بنا پر کہ وہ اس مذہب کی وکالت کا عہد کر چکے ہیں اور جس مسئلہ کو نہیں مانا اور اس سے اختلاف کیا وہ اس بنا پر کیا کہ دلیل اس کے خلاف ہے اس لیے نہیں کہ انہیں اس سے عناد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کہیں وہ حنفی نظر آتے ہیں کہیں شافعی کہیں مالکی اور کہیں حنبلی انہوں نے ان لوگوں سے اختلاف کیا ہے جو ایک مذہب کی پیروی کا قلادہ اپنی گردن میں ڈال کر (اسی کا نام تقلید ہے) گویا قسم کھالیتے ہیں کہ تمام معاملات میں اس کی پابندی کرینگے۔ (ایک انچ اس سے ادھر ادھر نہیں ہٹیں گے) اسی طرح وہ ان سے بھی اختلاف کرتے ہیں جنہوں نے آئمہ مذاہب میں سے کسی کی مخالفت کا گویا عہد کرلیا ہے۔ ان دونوں کے بین بین وہ ایک

عوام کا مسلک اور تحقیق حق کے متعلق آئمہ اربعہ رحمہم اللہ کے اقوال:

ان دونوں درجوں سے نیچے کا درجہ جس کو درجہ سوم کہنا چاہیے عوام کیلئے ہے۔ ان کے لیے یہ کافی ہے کہ شرع مقدس کے کثیر الوقوع مسائل اور احکام تو وہ اپنے گھر کے بزرگوں، اپنے مقامی علماء و فقہاء اور اپنے دوستوں سے اخذ کرلیا کریں اور اگر کوئی غیر معمولی صورت حاصل یا واقعہ پیش آئے تو اس کو کسی مفتی سے پوچھ لیا کریں۔ یا کوئی جھگڑا اور مقدمہ ہو تو قاضی شہر سے اس کا فیصلہ کرائیں۔ ہم نے تمام محققین علماء کو خواہ ان کا تعلق زمانہ قدیم سے ہے یا وہ عصر حاضر کے علمبر دار علم و فضل ہیں، سب کو اسی پر متفق پایا ہے (جو سطور بالا میں مذکور ہے) اور آئمہ مجتہدین نے اپنے تلامذہ اور اصحاب کو اسی کی تلقین کی ہے۔

علامہ شعرانیؒ الیواقیت و الجواہر میں لکھتے ہیں: امام ابوحنیفہؒ سے منقول ہے اور آپ کا قول ہے کہ جس کو میرے قول کی دلیل معلوم نہ ہو وہ میرا کلام سن کر کوئی فتویٰ نہ دے۔" یہ بھی امام صاحب سے منقول ہے کہ: "جب وہ اپنا کوئی قول بیان کرتے تو یہ فرماتے کہ: "یہ نعمان بن ثابت کی یعنی میری اپنی رائے ہے۔ میں نے انتہائی کوشش کرکے وہی بات اختیار کی ہے جو میرے نزدیک سب سے بہتر ہے۔ اب اگر کسی کو اس سے بہتر کچھ معلوم ہو تو ٹھیک بات یہ ہے کہ اسی کا اتباع کیا جائے اور میری بات کو چھوڑ دیا جائے۔

امام مالکؒ کہا کرتے تھے: "سوائے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی ایسا شخص نہیں جس کی بعض باتیں مقبول اور بعض مردود نہ ہوں۔"

حاکمؒ (مصنف مستدرک) اور بیہقیؒ نے امام شافعیؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: "جب کوئی صحیح حدیث تمہیں مل جائے تو بس وہی میرا مذہب ہے۔" ایک اور روایت یہ ہے کہ: "جب تم دیکھو۔ کہ میرا قول حدیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالف ہے تو حدیث ہی پر عمل کرو اور میرے قول کو دیوار پر دے مارو۔" ایک دن انہوں نے اپنے شاگرد خاص مزنیؒ سے کہا: "ابراہیم! ہر ایک بات میں میری تقلید نہ کرو خود تحقیق کرلیا کرو کیونکہ یہ دین کا معاملہ ہے۔" یہ بھی امام شافعیؒ کا قول ہے کہ: "رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے مقابلہ میں کسی کے قول کا کچھ اعتبار نہیں خواہ اس کے قائلین کی تعداد کتنی ہی زیادہ ہو۔ کوئی قیاس یا کوئی دلیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے مقابلہ میں پیش نہیں کی جاسکتی۔ صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت اور ان کے حکم کو تسلیم کرنا سب مسلمانوں پر واجب ہے۔"

امام احمدؒ کہتے ہیں: "اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے کلام کے مقابلے میں کسی کے کلام کی کچھ وقعت نہیں۔" ایک شخص سے امام احمدؒ نے کہا: "میری تقلید* مت کرو اور نہ ہی مالکؒ بن انس یا اوزاعیؒ یا نخعیؒ وغیرہ کی تقلید کرو۔ احکام شرعیہ کا ماخذ قرآن اور حدیث ہے۔ اسی سے انہوں نے اخذ کیا اور تم بھی اخذ کرو۔"

امام احمدؒ کہتے ہیں: "اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے کلام کے مقابلے میں کسی کے کلام کی کچھ۔ وقعت نہیں۔"

* الحمدللہ ہم اماموں "کو" تو مانتے ہیں۔ کاش ان اماموں "کی" بھی مانیں۔ آمین!

کورانہ تقلید تحریف دین کے عظیم ترین اسباب میں سے ہے:

من جملہ اسباب تحریف کے غیر معصوم ہستی کی تقلید کرنا ہے۔ غیر معصوم سے میری مراد ہر ایک ایسا شخص ہے جو نبی نہ ہو۔ جس کی عصمت ثابت ہو چکی ہے۔ تقلید کی حقیقت یہ ہے کہ امت کا ایک عالم مجتہد اجتہاد کر کے کوئی مسئلہ بتاتا ہے تو اس کے متبعین اس کو اس حد تک صحیح سمجھ لیتے ہیں کہ اس کے خلاف اگر کوئی صحیح حدیث بھی پیش کی جائے تو امام کے قول کی خاطر ان کے لیے اس حدیث کا رد کر دینا نہایت آسان ہوتا ہے جس کی تقلید کو علمائے امت نے جائز قرار دیا ہے وہ یہ ہے کہ آدمی (جاہل اور بے علم ہونے کی بناء پر) کسی عالم مجتہد کے قول کا اتباع کرے لیکن ساتھ ہی یہ اس کا یہ مستحکم عقیدہ ہو کہ وہ ایک غیر معصوم انسان ہے اور اس لیے اس کا قول غلط بھی ہو سکتا ہے چنانچہ علماء کا یہ متفق علیہ قول ہے (اور عقاید کی کتابوں میں لکھا جاتا ہے) کہ: المجتهد يخطئى و يصيب. ''مجتہد کا قول کبھی غلط ہوتا ہے اور کبھی درست ہوتا ہے۔'' ایسے مقلد کا فرض ہے کہ وہ ہمیشہ اس بات کے لیے تیار رہے کہ اگر کسی مسئلہ میں اس کو اپنے امام کے قول کے خلاف کوئی بات مل جائے تو وہ فوراً اس کو ترک کر کے حدیث کا اتباع کرے گا۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے عدیؓ بن حاتم نے اس آیت کے متعلق: اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ. انہوں نے (یہود و نصاریٰ نے) خدائے بزرگ و برتر کو چھوڑ کر اپنے علماء اور مشائخ کو خدا بنا رکھا تھا۔'' یہ شبہ ظاہر کیا کہ وہ تو ان کو خدا نہیں سمجھتے تھے! تو آپ نے ارشاد فرمایا: ''کیا وہ ان کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام نہیں سمجھتے تھے؟'' عدیؓ نے کہا ''کیوں نہیں؟'' آپؐ نے فرمایا: ''خدا بنا لینے کے یہی معنی ہیں۔''

اختلاط ادیان کی حقیقت:

من جملہ اسباب تحریف کے ایک یہ ہے کہ ایک دین کے احکام دوسرے دین کے احکام کے ساتھ غلط ملط ہو جائیں، اس کی حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی دین کو جس کا وہ پہلے پابند تھا چھوڑ کر دین حق میں داخل ہوتا ہے تو دین سابق کے عقاید و اعمال اور رسوم کے اثرات اس کے نفس باطن کے ساتھ چمٹے رہتے ہیں۔ اور اس لیے ملت سابقہ کی بعض چیزوں کو وہ چھوڑنا پسند نہیں کرتا اور ان کے لیے اس نئے دین میں بلا وجہ جواز ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے۔ گو وہ توجیہہ کتنی ہی کمزور ہو یا اس کی بنا کسی حدیث موضوع پر ہو بلکہ اس کے جواز کو ثابت کرنے کیلئے وہ وضع حدیث* تک کو جائز سمجھتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول اسی بارے میں ہے کہ: ''نبی اسرائیل کا دین کچھ مدت تک اپنی اصلی حالت پر قائم رہا لیکن جب ان کے دین میں دوسری اقوام کے لوگ داخل ہوئے اور لونڈی غلام ان میں شامل ہوئے تو ان کا دین بگڑ گیا۔ انہوں نے اپنی رائے استعمال کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود تو گمراہ تھے دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔'' (شاہ صاحبؒ نے اس حدیث سے پہلے جو کچھ کہا اس کی (ہم اہل ہندو پاک کے لیے) ایک واضح مثال یہ ہے کہ کوئی ہندو مسلمان ہوتا ہے اور چونکہ گائے کے تقدس کا اثر اس کے ذہن میں موجود ہوتا ہے اس لیے وہ گائے کا گوشت کھانا پسند نہیں کرتا اور اس سے پرہیز کرنے کے لیے وجہ جواز یہ نکال لیتا ہے کہ گائے کا گوشت کھانا فرض، واجب یا مستحب تو ہے نہیں، اس لیے میں نہ کھایا کروں تو کیا ہرج ہے: (يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِى السِّلْمِ كَآفَّةً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ کی آیت اسی بارے میں ہے۔)

* لہذا صرف صحیح احادیث پر اپنے عقائد و اعمال کی بنیاد رکھی جائے۔

چوتھا باب

چوتھی صدی ہجری سے پہلے اجتہاد اور تقلید کا کیا حال تھا!

چوتھی صدی سے پہلے کسی خاص امام کی تقلید کو ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا:

چوتھی صدی سے پہلے لوگوں میں یہ خیال اور عقیدہ شائع و ذائع نہیں تھا کہ کسی معیّن مذہب کی جملہ مسائل میں تقلید کرنا ضروری ہے۔ ابوطالب مکی (جو ایک مشہور صوفی بزرگ ہیں) اپنی معرکۃ الآراء تصنیف قوت القلوب میں لکھتے ہیں: ''یہ تصنیفات اور یہ مجموعے قرون اولیٰ کے بعد کی پیداوار ہیں۔ قرن اول اور قرن ثانی میں یہ باتیں مطلق نہیں تھیں، کہ فلاں کا قول یہ ہے اور فلاں یہ کہتا ہے، یا یہ کہ ہمیشہ کسی ایک عالم مجتہد کے مذہب پر فتویٰ دیا جائے ہر ایک مسئلہ میں اسی کے قول کو سند مانا جائے اور اسی کا حوالہ دیا جائے اور جو عالم بننا چاہے وہ صرف کسی ایک عالم مجتہد کے مذہب میں تبحر حاصل کرے۔'' میں کہتا ہوں (حضرت شاہ صاحبؒ کہتے ہیں) دوسرے قرن کے بعد فی الجملہ ان میں تخریج نے پنپنا شروع کیا۔ چوتھی صدی ہجری تک یہ کیفیت تھی کہ لوگ بالخصوص کسی ایک مذہب کی تقلید کرنا اور صرف اسی کا علم حاصل کرنا ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ جیسے کہ واقف حال علماء سے مخفی نہیں۔ امر واقع یہ ہے کہ لوگوں کی دو جماعتیں تھیں، علماء اور عوام، عوام کا یہ حال تھا کہ مسائل اجماعیہ میں جن میں کہ کسی مجتہد کا اختلاف نہیں۔ وہ صاحب شرع علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قول اور عمل پر کاربند ہوتے تھے، وضو اور غسل اور نماز روزہ وغیرہ کی کیفیت اپنے گھر کے بزرگوں یا اپنے شہر کے کسی عالم سے سیکھا کرتے تھے۔ جب کوئی واقعہ پیش آتا۔ جس کا وہ حکم شرعی معلوم کرنا چاہتے تو وہ کسی عالم سے پوچھ لیتے تھے اور اس پر عمل پیرا ہوتے تھے۔ اس عالم کی بابت یہ تفتیش نہیں کرتے تھے کہ وہ کس مذہب کا عالم ہے۔

علماء کا یہ حال تھا کہ بعض ان میں سے جو اہل حدیث کہلاتے تھے وہ علم حدیث میں تبحر حاصل کرنا اپنا مقصد اولین سمجھتے تھے اور ان کے پاس احادیث نبویہ اور آثار صحابہ و تابعین کا اس قدر ذخیرہ جمع ہو جاتا کہ اس کے ہوتے ہوئے وہ کسی مسئلہ کا حکم استخراج کرنے میں کسی دوسری چیز کے محتاج نہیں ہوتے تھے ہر ایک مسئلہ میں ان کے پاس یا تو کوئی حدیث مستقل یا کوئی ایسی حدیث موجود ہوتی جس پر کسی نہ کسی فقیہہ مجتہد نے عمل کیا ہوتا اور اس عمل نہ کرنے کی کوئی وجہ ان کو نظر نہیں آتی تھی یا انکو جمہور صحابہ اور تابعین کا کوئی ایسا متفق علیہ قول مل جاتا جس کی مخالفت کرنا کسی صاحب بصیرت کے نزدیک مستحسن نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اگر بالفرض کسی مسئلہ کے متعلق دلائل میں تعارض ہوتا اور کسی ایک دلیل کو ترجیح دینا مشکل ہو جاتا اور اس لیے ان کا دل کسی بات سے بھی مطمئن نہ ہوتا تو ایسی صورت وہ زمانہ گزشتہ کے علمائے مجتہدین کے اقوال سے اس کا حکم ڈھونڈ لیتے۔ اگر مجتہدین کے اقوال مختلف ہوتے تو ان میں سے کسی ایسے قول کا اختیار کرتے جو ان کے نزدیک زیادہ قابل وثوق و اعتماد ہوتا۔

قطع نظر اس سے کہ وہ اہل مدینہ کا قول ہو یا اہل کوفہ کا مذہب ہو۔ جب ان کو مذکور بالا صورتوں میں سے کسی ایک کے مطابق بھی حکم کی تصریح معلوم نہ ہوسکتی تو وہ مجتہد فی المذہب کے طور پر حکم کی تخریج عمل میں لاتے، جن آئمہ کے اصول کو سامنے رکھ کر تخریج کرتے انہی کی طرف ان کو منسوب کیا جاتا۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ وہ شافعی ہے یا حنفی، چنانچہ اہل حدیث علماء میں سے جس کے اکثر مجتہدات کسی مشہور امام مجتہد کے موافق ہوتے اس کو بعض اوقات اسی امام کی طرف منسوب کیا جاتا۔ نسائی اور بیہقی کو اسی بنا پر شافعی 1 کہا جاتا ہے۔ یہ نکتہ بھی یاد رکھو کہ اس عہد میں قضاء اور افتاء کا منصب صرف اسی کو دیا جاتا جو مجتہد ہو اور فقیہہ بھی وہی کہلاتا جو مجتہد ہو۔

اس طبقہ کے لوگ کن آفتوں میں مبتلا ہوئے (جدول کی بنیاد کس طرح پڑی):

اس طبقہ کے بعد جو لوگ پیدا ہوئے انہوں نے شاہراہ کو چھوڑ کر دائیں بائیں کی پگڈنڈیاں پکڑ لیں اور کئی ایک نئی باتیں ان میں پیدا ہوگئیں۔ من جملہ ان کے ایک بلائے عام 2 "جدل" (جس کو وہ غلط تسمیہ کے طور پر مناظرہ کہتے ہیں) اور فقہی خلافیات کا علم ہے۔ اس کی تفصیل امام غزالیؒ نے احیاء العلوم کی کتاب العلم میں اس طرح لکھی ہے: خلفائے راشدین کا زمانہ گزر جانے کے بعد خلافت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آئی جو اس کے اہل نہیں تھے اور احکام شرعیہ سے ناواقف محض ہونے کی وجہ سے اس قابل نہیں تھے کہ کسی قضیہ (مقدمہ) کا شرعی فیصلہ کرسکیں، اس لیے ان کو ضرورت پیش آئی کہ اس بارے میں فقہاء سے مدد لیں اور ہر وقت ان کو اپنے ساتھ رکھیں۔ اس وقت تک بھی ایسے پاک نفس علماء موجود تھے جو قرن اول و ثانی کے علماء کا طریقہ سنبھالے ہوئے تھے اور دین خالص کے پابند تھے۔ تحریف و بدعت کی آمیزشوں سے ان کا دین محفوظ تھا ان لوگوں کو جب خلفاء نے اپنی مصاحبت کے لیے بلایا تو وہ چھپ گئے۔ اس سے جاہ طلب نفوس کو علماء کی عزت عظمیٰ کا احساس ہوا کیونکہ وہ دیکھتے تھے کہ خلفاء تک کے قرب کو وہ اپنی شان کے منافی سمجھتے ہیں اور پھر بھی خلفاء ان کے پیچھے مارے مارے پھرتے ہیں۔ چنانچہ اس عزت کو حاصل کرنے کی خواہش ان کے دلوں میں پیدا ہوئی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلی حالت کے برعکس اب وہی جماعت جو مطلوب تھی طالب بن گئی اور جو پہلے طالب تھی مطلوب قرار پائی۔ اور جو عزت کبریٰ علماء کو ان کے اعراض کی وجہ سے حاصل تھی وہ ان کے ادھر متوجہ ہونے سے مبدل بہ ذلت ہوگئی۔ ہاں جن پر خدائے پاک کی نظر عنایت تھی وہ اس فتنہ سے محفوظ رہے۔

---

1. یہاں اس بات پر توجہ دلانا ضروری ہے کہ یہ مشہور ہے اور بعض تذاکر حیات میں بھی لکھا ہوتا ہے کہ مثلاً امام بخاریؒ کے شافعی تھے' اس کے بھی یہی معنی ہیں کہ وہ منسوب بہ شافعی تھے' کیونکہ امام شافعیؒ ہی کے اصول فقہ و تشریع کو پیش نظر رکھ کر اجتہاد کرتے تھے۔ ورنہ درحقیقت وہ اصحاب الحدیث میں سے تھے' الغرض یہ ایک بہت بڑ غلط فہمی ہے جس میں کہ اکثر علماء مبتلا ہیں۔ اس لیے اس نکتہ کو اچھی طرح یاد رکھیں۔ ان سطور میں شاہ صاحبؒ نے اسی غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے۔

2. جدل کے معنی ہیں بحث و مناظرہ کرنا۔ لیکن جدل عموماً اس بحث و مناظرہ کو کہتے ہیں جس میں جھگڑنے کا پہلو غالب ہو۔ اس حالت میں احقاق حق (یعنی چھان بین کر کے حق بات دریافت کرنا) فریقین میں سے کسی کے پیش نظر نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر ایک کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ حریف کو شکست دے اور اسی بات کا سچا تسلیم کرلیا جائے یعنی پبلک اس کو سچا سمجھ لے۔ چاہے دراصل وہ محض باطل پر کیوں نہ ہو۔ کیونکہ اس میں ہر ایک فریق اپنی بڑائی چاہتا ہے۔ اس لیے اس قسم کی بحث کو مکابرہ بھی کہتے ہیں۔

سفر کیا اور مؤطائے مالک امام مالکؒ سے پڑھا۔ اپنے وطن مالوف کو لوٹ کر انہوں نے اپنے اساتذہ کے مذہب کا ایک ایک مسئلہ موطا کی احادیث اور آثار پر رکھا۔ اگر وہ کسی مسئلہ کو ان کے موافق پائے توازیں چہ بہتر، کہہ کر اس پر مہر تصدیق ثبت کردیتے۔ جس مسئلہ میں ان کو اختلاف نظر آتا تو اگر صحابہ اور تابعین کی ایک اچھی خاصی جماعت کو امام ابوحنیفہؒ کے قول کے موافق پاتے تب بھی وہ اپنے مذہب کا قول نہیں چھوڑتے تھے لیکن اگر انہیں معلوم ہوتا کہ ہمارے مذہب کا کوئی مسئلہ قیاس ضعیف پر مبنی ہے یا وہ غیر محتاطانہ تخریج ہے، اور اگر کسی ایسی حدیث صحیح کے مخالف ہے جس پر فقہاء اسلام نے عمل کیا ہے یا وہ کوئی ایسا قول ہے جس کو اکثر اہل علم نے اخذ نہیں کیا اور اس کے مخالف قول پر وہ عمل پیرا ہوئے ہیں۔ تو پھر اپنے مذہب کو چھوڑ کر مذاہب سلف میں سے کوئی قول اختیار کرلیتے جو ان کی رائے میں راجح تر ہوتا۔ یہ دونوں صاحبان (امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ) حتی الامکان ابراہیم نخعی اور ان کے اقران و امثال کے مسلک کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ بعینہٖ جس طرح کہ امام ابوحنیفہؒ کا طرز عمل تھا۔ ان کا اختلاف اپنے قدیم مسلک سے مفصلہ ذیل دو باتوں میں سے کسی ایک میں ہوا کرتا تھا۔ یا تو یہ کہ امام ابوحنیفہؒ نے ابراہیمؒ نخعی کے مذہب کے مطابق کوئی تخریج کی ہوئی تھی اور وہ اپنے اجتہاد سے کسی مختلف نتیجہ پر پہنچ جاتے یا یہ کہ ابراہیمؒ نخعی اور اس کے اقران و امثال سے کسی مسئلہ میں مختلف اقوال منقول ہوتے اور ان میں سے کسی ایک کو ترجیح دینے کے بارے میں وہ اپنے استاد سے اختلاف کرتے، امام محمدؒ نے اپنی تصنیفات میں ان تینوں رائے ہر ایک مسئلہ کے متعلق قلم بند کی جس سے بہت لوگوں نے استفادہ کیا۔ اس مسلک کے پابند علماء کی تمام تر توجہ انہی کتب کی تلخیص و تقریب اور شرح و تخریج پر مبذول رہی۔ انہی کتب کو اساس قرار دیکر بے شمار مفروضہ صورتوں کا حکم استخراج کیا اور بیان مسائل میں انہی سے استدلال کرتے رہے۔ اس کے بعد وہ خراسان اور ماوراء النہر کے صوبوں میں پھیل گئے۔ اسی مسلک کا نام مذہب حنفی مشہور ہوا۔

امام شافعیؒ کے جلیل القدر کارنامے اہل مدینہ اور اہل کوفہ کے مذہب پر تنقید:

امام شافعیؒ اس وقت پیدا ہوئے جب کہ یہ دونوں مذہب (مذہب مالکی اور مذہب حنفی ظہور میں آچکے تھے اور ان کے اصول اور فروع کو ترتیب دی جاچکی تھی۔ جب انہوں نے ان مذاہب پر ناقدانہ نظر ڈالی تو ان کو ان میں بہت سی خامیاں نظر آئیں۔ جن کا انہوں نے کتاب الام کے اوائل میں ذکر کیا ہے۔ من جملہ ان کے ایک یہ کہ ان مذاہب کے علماء مرسل اور منقطع سے استدلال کرنا جائز سمجھتے تھے۔ اس سے بڑا خلل پیدا ہوتا تھا۔ کیونکہ جب احادیث کے طریق مختلفہ کو یکجا کرکے دیکھا جاتا ہے۔ کہ بہت سے مرسل ایسے ہیں جن کی کوئی اصلیت نہیں اور بہت سے مرسل ایسے ہیں جن کا مفہوم مسند حدیث کے خلاف ہے اس لیے شافعیؒ نے اپنا اصول یہ مقرر کیا کہ مرسل کو سند نہ مانا جائے۔ الا یہ کہ چند شروط اس میں پائی جائیں۔ یہ شرطیں شافعیہ کے کتب اصول میں مذکور ہیں۔ من جملہ ان کے یہ کہ ان کے ہاں مختلف المفہوم حدیثوں کو تطبیق دینے کے لیے معین اصول نہیں تھے۔ اس لیے مجتہدات میں یکسانی نہیں ہوتی تھی اور اس سے بعض اوقات خلل عظیم پیدا ہوتا تھا۔ چنانچہ جمع بین المختلفات کے لیے انہوں نے اصول وضع کیے اور ان کو کتابی صورت میں مدون کیا۔ علم اصول فقہ کی یہ پہلی تصنیف تھی، اس کی ایک مثال یہ ہے کہ جب محمدؒ بن الحسن سے ان کی ملاقات ہوئی تو ان کو اہل مدینہ کے مذہب پر یہ اعتراض کرتے ہوئے سنا

کہ وہ ایک گواہ کی شہادت کو اس شرط پر مقبول قرار دیتے ہیں کہ حلف اس کے ساتھ شامل ہو۔ وجہ یہ بتائی، کہ ان کا یہ قول زیادۃ علیٰ کتاب اللہ ہے (یعنی کتاب اللہ میں اثبات دعویٰ کے لیے فقط دو گواہوں کا ذکر ہے۔ شاہد مع الیمین کو بھی اثبات مدعا کا موجب قرار دینا کتاب اللہ کے مفہوم میں زیادتی کرنا ہے)۔" امام شافعیؒ نے کہا: "کیا تم اس کو ایک اصول مانتے ہو اور قاعدہ کلیہ سمجھتے ہو۔ کہ خبر واحد کی بنا پر نص قرآنی کے مفہوم میں زیادتی پیدا کرنا جائز نہیں؟" امام محمدؒ نے اس کا جواب اثبات میں دیا۔ امام شافعیؒ نے کہا: "تو پھر تم نے: الا لاوصیة لوارث. "وارث کے حق میں یہ وصیت کرنا جائز نہیں۔" کی حدیث پر جو خبر واحد ہے کیوں عمل کیا؟ بحالیکہ اس آیت سے صریحاً اس بات کا اثبات ہوتا ہے: کُتِبَ عَلَیْکُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ اِلیٰ آخر الآیته. اسی قسم کے چند ایک اور بھی ایزادات کیے تو امام محمدؒ لاجواب ہو کر چپ ہو گئے۔ من جملہ ان کے یہ کہ بعض علمائے تابعین صحیح حدیثیں نہیں پہنچی ہیں۔ بنابرآں جب ان سے فتویٰ پوچھا گیا تو انہوں نے قوت اجتہادی استعمال کر کے اپنی رائے کے مطابق فتویٰ دیا۔ اس میں انہوں نے عمومات سے استدلال کیا اور صحابہ کے اقوال کو سند لائے (لیکن حدیث صحیح سے بے خبر رہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اجتہاد سے جو فتویٰ دیا وہ اس حدیث کے مخالف تھا) لیکن بعد میں وہ حدیث علمی حلقوں میں مشہور ہوگئی۔ بایں ہمہ طبقہ ثالثہ کے علماء نے اس پر عمل نہ کیا کیونکہ انہوں نے اپنے اساتذہ اور شیوخ کے قول کو اس کے خلاف پایا اور سمجھے کہ یہ حدیث اجماع کے مخالف ہے اس لیے وہ قابل قبول نہیں۔ (حقیقت حال سمجھنے سے وہ قاصر رہے) ان کا خیال یہ تھا کہ تابعین نے اس پر اس لیے عمل نہیں کیا کہ ان کو اس میں کوئی علت نظر آئی، یہ ہوسکتا ہے کہ بعض صحیح حدیثیں تیسرے طبقہ میں بھی غیر معروف رہی ہوں لیکن جب طلاب حدیث نے دور دراز سفر کرے اور مختلف اقطار و امصار میں پہنچ کر حدیثیں جمع کیں تو وہ حدیثیں جو پہلے دونوں طبقات میں مستور رہ چکی تھیں منظر عام پر آگئیں اور ان کی صحت میں کچھ بھی شک باقی نہ رہا۔ کیوں کہ ان لوگوں نے حاملان علم دین کے ساتھ اس بارے میں بحث و تمحیص کر کے ان کی صحت کو ثابت کیا۔ بہت حدیثیں اس قسم کی ہیں کہ قرن اول میں ان کو فقط ایک یا دو صحابیوں نے روایت کیا اور دوسرے تیسرے طبقہ میں بھی ان کی یہی حالت رہی۔ اس لیے وہ فقہا مجتہدین کی نظروں سے اوجھل رہیں۔ چنانچہ جب حفاظ حدیث نے مختلف طرق اور اسانید کو جمع کیا تو انہوں نے بہت سی حدیثوں کا کھوج لگایا جن کی صحت مرض خفا میں مبتلا تھی۔ مثلاً ایک حدیث کو فقط اہل بصرہ نے روایت کیا اور دوسرے بلادو امصار کے لوگ اس سے قطعاً بے خبر رہے۔ امام شافعیؒ نے اس حقیقت کو واضح کیا اور کہا کے علماء صحابہ و تابعین کا یہ اصول تھا کہ وہ ہمیشہ حدیث مرفوع* کی تلاش میں رہتے تھے اگر کوئی حدیث ان کی نظر ثاقب سے مخفی رہتی تو بنا بر ضرورت وہ اپنی قوت اجتہاد استعمال کر کے پیش آمدہ مسئلہ کا جواب اپنی رائے سے نکال لیتے لیکن جونہی کسی حدیث صحیح کا انہیں علم ہوتا تو وہ فوراً اپنے اجتہاد کو ترک کر کے حدیث پر عمل پیرا ہوتے۔ جب یہ امر واقع تمہارے ذہن نشین ہوگیا تو اب تم بآسانی سمجھ سکتے ہو کہ ان کا کسی حدیث پر عمل نہ کرنا اس بات کی ہرگز دلیل نہیں کہ ان کو اس میں کوئی علت قادحہ نظر آئی (حقیقت یہ ہے کہ وہ حدیث ان تک پہنچی ہی نہیں) ہاں یہ اور بات ہے کہ انہوں نے کسی علت قادحہ کی تصریح کر دی ہو۔ اس کی مثال قلتین کی حدیث ہے۔ یہ ایک صحیح الاسناد حدیث ہے جو مختلف طریقوں سے مروی ہے، جس کو ابن عمرؓ سے صرف دو راویوں نے سنا اور روایت کیا ہے لیکن بعد میں اس کو کثیر التعداد راویوں نے مختلف طریقوں سے روایت کیا۔ یہ دونوں راوی (جنہوں نے ابن عمرؓ سے روایت کی ہے) اگرچہ ثقہ اور قابل اعتماد و استناد ہیں لیکن مسند افتاء

★ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہو۔

پر بیٹھنا ان کو نصیب نہیں ہوا اور اس لیے وہ اپنے عہد میں مشہور نہیں تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سعیدؒ بن المسیب کے زمانہ میں اس روایت کو فروغ حاصل نہ ہوسکا اور نہ ہی امامؒ زہری کو اس حدیث کا علم ہو سکا۔ چنانچہ مالکیہ اور حنفیہ نے اس پر عمل نہ کیا لیکن شافعی کے زمانہ میں یہ حدیث منظر عام پر آ گئی اور اس کی صحت میں کچھ بھی شک باقی نہ رہا تو انہوں نے اس پر عمل کیا۔ اس کی دوسری مثال خیار المجلس کی حدیث ہے۔ یہ بھی ایک صحیح حدیث ہے جو مختلف طرق اور اسانید سے مروی ہے۔ صحابہ میں سے ابوہریرہؓ اور ابن عمرؓ نے اس پر عمل کیا ہے۔ بایں ہمہ فقہائے سبعہ اور ان کے معاصر علماء نے اس پر عمل نہیں کیا (وہی وجہ جو اوپر مذکور ہوئی کہ حدیث ان کو پہنچی ہی نہیں۔ اس لیے بنا بر ضرورت انہوں نے اجتہاد کر کے اس کا حکم نکالا) امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ نے یہ سمجھا کہ انہیں اس میں کوئی علت قادحہ نظر آئی، اس لیے انہوں نے اس پر عمل نہیں کیا۔ شافعیؒ کو جب معلوم ہوا کہ یہ ایک حدیث صحیح ہے تو انہوں نے اس پر عمل کیا۔

امام شافعیؒ کی بلند نظری (حق کو سب سے بڑی طاقت سمجھنا):

من جملہ ان کے یہ کہ صحابہ کے اقوال شافعیؒ کے زمانہ تک بکثرت جمع ہو گئے تھے اور جب انہوں نے بہ غور دیکھا تو انہیں معلوم ہوا کہ بہت سے اقوال حدیث صحیح کے مخالف ہیں۔ کیوں کہ حدیث ان کو نہیں پہنچتی تھی، اس لیے ضرورتاً انہوں نے اپنی قوت اجتہاد قوت اجتہاد سے کام لیا (اور بمقتضائے بشریت انہیں اپنی رائے قائم کرنے میں غلطی ہوئی) امام شافعیؒ یہ بھی جانتے تھے کہ علمائے سلف* کا یہی اصول رہا ہے کہ جب کوئی صحیح حدیث انہیں پہنچ جاتی تو وہ فوراً بلا توقف و تاخیر اپنے پہلے قول سے رجوع کر لیتے۔ چنانچہ شافعیؒ نے بھی اسی اصول پر عمل کیا اور جب تک جملہ صحابہ کا کسی ایک قول پر اتفاق نہ ہوتا، افراد صحابہ کے اقوال کو وہ قابل استناد نہیں سمجھتے تھے (اور حدی کی تلاش میں رہتے تھے) آپ کا قول ہے: ھم رجال و نحن رجال. ''وہ بھی آدمی ہیں اور ہم بھی آدمی ہیں۔

استحسان کا ابطال (رائے اور قیاس کا فرق):

من جملہ ان کے یہ کہ انہوں نے دیکھا کہ بعض فقہاء رائے اور قیاس میں کچھ فرق نہیں کرتے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ''قیاس صحیح کو تو شرع نے سند مانا ہے لیکن رائے کا اتباع کرنا شریعت میں جائز نہیں۔'' اس رائے کو وہ استحسان کہتے ہیں جس کی ماہیت یہ ہے کہ جہاں حرج اور تکلیف کا مظنۃ نظر آیا یا یہ کہ فلاں عمل مثلاً حصول مصلحت کا مظنۃ ہے۔ اس کو حکم کی علت موجبہ قرار دے دیا۔ بر خلاف اس کے قیاس کی حقیقت یہ ہے کہ کسی حکم منصوص کی علت دریافت کر لی جائے اور جہاں وہ علت پائی جائے، حکم مذکور کو اس پر حاوی کر لیا جائے۔ بالفاظ دیگر اس علت کو مناط حکم قرار دیا جائے۔ (اب ہر ایک شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان دونوں میں کتنا فرق ہے، قیاس کسی ایک حکم شرعی سے دوسرے حکم کا استخراج کرنا ہے لیکن استحسان میں اپنی رائے کو حکم شرعی کی پیرایہ میں ظاہر کیا جاتا ہے) اس قسم کی رائے جو استحسان سے موسوم ہے، انہوں نے نہایت سختی سے ابطال کیا۔ آپ کا قول ہے کہ ''استحسان'' کے یہ معنی ہیں کہ کوئی شخص منصب تشریع کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا ہے۔ بالفاظ سہل تر، جو کوئی استحسان کرتا ہے وہ گویا خود شارع بننا چاہتا ہے۔ امام شافعیؒ کے اس قول کو ابنؒ حاجب نے مختصر الاصول میں ذکر کیا ہے۔

* الھی علماء کی نسبت سے لوگ سلفی کہلانے لگے

اس کی مثال یہ ہے کہ یتیم کو اس کا مال سپرد کرنے کے لیے کلام مجید میں رشد کو شرط قرار دیا ہے لیکن رشد ایک امر خفی ہے۔ اس لیے انہوں نے اپنی رائے سے پچیس سال کی عمر کو مظنۂ رشد قرار دے کر حکم کو اسی پر دائر کیا۔ یعنی یہ کہ جب یتیم پچیس سال کا ہو جائے تو اس کو اس کا مال سپرد کر دیا جائے۔ ان کا قول ہے کہ یہ قیاس کا اقتضاء نہیں کہ مال اس کو سپرد کیا جائے بلکہ اس کی بناء استحسان پر ہے، خلاصہ یہ کہ جب امام شافعیؒ کو اوائل کے طریق اجتہاد اور تخریج احکام میں اس قسم کے نقائص نظر آئے تو انہوں نے تمام فقہ کو ازسر نو ترتیب دیا۔ اس لیے نئے اصول مقرر کیے اور انہی اصول کو پیش نظر رکھ کر فروع کا استخراج کیا اور کئی ایک کتابیں اس بارے میں تصنیف کیں جو نہایت مفید اور نفع بخش ثابت ہوئیں۔ فقہائے وقت نے آپ کو امام تسلیم کیا اور آپ کی کتب اور تصانیف کا اختصار کر کے ان کی شروح لکھ کر اور ان سے استدلال اور تخریج کر کے ان کے مذہب کی اشاعت کی، ان لوگوں کے مختلف بلاد و امصار میں پھیل جانے سے امام شافعیؒ کے مذہب کو جس کی اصلیت ابھی ہم نے تمہیں بتائی ہے فروغ حاصل ہوا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

امام احمدؒ بن حنبلؒ کی عظیم شخصیت اور اہلحدیث بننے کے شرائط:

اس طبقہ کی سب سے بڑی شخصیت امام احمدؒ ابن حنبل کی ہے۔ جن کی شان سب سے بلند ان کی روایت سب سے زیادہ وسیع، حدیث کی نوعیت کے وہ سب سے زیادہ پہچاننے والے نقادفن اور تفقہ فی الحدیث میں ان کی نظر سب سے زیادہ عمیق اور دور رس ہے۔ دوسرا درجہ اسحٰقؒ بن راہوہ کا ہے۔ یاد رکھو۔ اصحاب الحدیث کے اصول پر سب احکام فقہ کا استخراج کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ آدمی کے پاس احادیث اور آثار کا بہت بڑا ذخیرہ محفوظ اور موجود ہو۔ چنانچہ جب احمدؒ بن حنبل سے پوچھا گیا۔ کیا فتویٰ دینے کے لیے یہ کافی ہے کہ آدمی کو ایک لاکھ حدیثیں یاد ہوں؟ امامؒ صاحب نے اس کا جواب نفی میں دیا۔ یہاں تک کہ سائل نے کہا۔ کیا پانچ لاکھ حدیثوں کا یاد کرنا کافی نہیں ہوگا؟ تو آپ نے فرمایا: ''غالباً کافی ہوگا۔'' یہ روایت غایۃ المنتہی کے مصنف نے ذکر کی ہے۔ اس فتویٰ دینے سے سائل کا مطلب الحدیث کے مسلک کے مطابق فتویٰ دینا تھا۔

صحاح ستہ کی بنیاد کہاں سے پڑی:

اس طبقہ کے گزر جانے کے بعد جو دوسرا طبقہ ان کی بجائے ظہور میں آیا۔ انہوں نے دیکھا کہ احادیث و آثار کو مدون اور محفوظ کرنے کا کام تو احسن طریقہ پر سرانجام ہو چکا ہے اور اصحاب الحدیث کے اصول کے مطابق اس سے مسائل بھی استخراج کیے جا چکے ہیں۔ اس لیے انہوں نے دوسرے فنون حدیث کی تکمیل پر اپنی توجہ مبذول کی۔ جیسے کہ ان احادیث صحیحہ کا الگ مجموعہ تیار کرنا، جن کی صحت پر کبراء اہل حدیث مثلاً زید بنؒ ہارون، یحیٰ بنؒ سعید القطان، احمد بن حنبل، اسحاقؒ بن راہویہ، وغیرہ نے اتفاق کیا ہو۔ یعنی جن حدیثوں کو ان کے ہاں مجمع علیہ مانا جاتا ہو۔ یا یہ کہ سنن کی کوئی ایسی کتاب تالیف کی جائے جس میں وہ تمام احادیث جمع کردی جائیں جو مختلف فقہاء مجتہدین کے مذاہب فقہ کا ماخذ ہیں یا مثلاً کوئی ایسا مجموعہ احادیث مرتب کرنا جس میں ہر ایک حدیث کی نوعیت کی تعیین، کر دی جائے اور ان شواذ حدیث اور غرائب اخبار و آثار کو بھی اس میں درج کر دیا جائے جن کی روایت پہلے طبقہ کے لوگوں نے نہیں کی ہے یا روایت کی ہے لیکن انہوں نے ان کے بعض ایسے طرق روایت قلمبند کیے جن میں اس قسم کی کوئی خصوصیت پائی جائے کہ حدیث منقطع حدیث مفصل ہو جائے۔ یا علو اسناد کا امتیاز اس حدیث میں پیدا ہو جائے۔ یا اس اسناد کے تمام راوی فقیہہ یا حافظ حدیث ہوں۔ کوئی بھی ان میں سے غیر فقیہہ یا غیر حافظ حدیث نہ ہو۔ یا اسی طرح کا کوئی اور نکتہ علمیہ کسی حدیث کے اسناد وغیرہ سے حاصل ہوتا ہو۔ اس طبقہ کے علمبردار محمدؒ بن اسمٰعیل بخاری مصنف جامع صحیح، مسلمؒ بن حجاج القشیری مصنف صحیح مسلم، ابوداؤد سجستانی مصنف سنن ابی داؤد، محمدؒ بن عیسیٰ ترمذی، ترمذی، نسائی، ابن ماجہؒ، دارقطنی، حاکم مصنف المستدرک، بیہقیؒ مصنف سنن کبریٰ، عبدؒ بن حمید، خطیبؒ، دیلمیؒ، ابنؒ عبدالبر، وغیرہ ہیں۔ میرے نزدیک چار اصحاب ان میں سے خاص طور پر ممتاز ہیں جن کا علم سب سے زیادہ وسیع اور جن کی تصنیفات سب سے زیادہ مشہور اور مفید تر ہیں۔ یہ چاروں اصحاب تقریباً ہمعصر ہیں۔

بخاری کی جامع صحیح پر تبصرہ:

(1) ابو عبداللہ محمدؒ بن اسمٰعیل بخاری، جامع صحیح تصنیف کرنے سے ان کی غرض یہ تھی کہ ان تمام احادیث کو ایک جگہ پر جمع کر دیا جائے جو صحیح متصل مستفیض ہوں۔ یہ بات بھی ان کے پیش نظر تھی کہ نہ صرف وہ حدیثیں جمع کی جائیں جن سے فقہی احکام مستنبط ہوتے ہیں بلکہ جن احادیث اور آثار کا تعلق سیرۃ اور تفسیر وغیرہ سے ہے ان کو بھی اس کتاب میں جگہ دی جائے۔ انہوں نے اپنی تصنیف ''جامع صحیح'' میں شروع سے آخر تک ان دونوں باتوں کو ملحوظ رکھا اور ان کی پابندی کی ہے، معتبر ذرائع سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ صالحین میں سے کسی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور آپ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ محمد بن ادریس کی فقہ میں کیوں اس قدر مشغول ہو۔ میری کتاب کو کیوں نہیں پڑھتے ہو؟ اس نے عرض کیا۔ یا رسولؐ اللہ! آپؐ کی کتاب کون سی ہے؟ آپؐ نے فرمایا۔ ''صحیح بخاری'' بخدا یہ ایک امر واقع ہے کہ صحیح بخاری کو اس قدر شہرت حاصل ہوئی ہے اور عامہ اہل علم میں اس نے وہ مقبولیت پائی ہے جس سے زائد شہرت اور مقبولیت تصور میں نہیں آسکتی۔

صحیح مسلم کی حقیقت:

(2) مسلمؒ نیشا پوری۔ انہوں نے صحیح مسلم اس غرض سے تصنیف کی کہ ان صحیح اور متصل مرفوع حدیثوں کو جمع کریں۔ جن کی صحت پر اجلہ اہل حدیث کا اتفاق ہے۔ جن سے جملہ احکام شرعیہ کا استنباط کیا جاسکے۔ ان کے پیش نظر یہ بات بھی تھی کہ اس کی ترتیب وغیرہ عام فہم ہو اور اس سے احکام کا استخراج کرنا ہر ایک ذی علم کے لیے بہت آسان ہو۔ چنانچہ انہوں نے احادیث کو نہایت عمدگی کے ساتھ ترتیب دیا اور ہر ایک حدیث کے مختلف اسناد کو یکجا کر کے دکھایا۔ تاکہ متن حدیث کا اختلاف بخوبی واضح ہو جائے اور طرق حدیث نمایاں طور نظر آئیں۔ اسی طرح انہوں نے مختلف حدیثوں کو ایک ہی جگہ پر درج کتاب کیا (تاکہ تطبیق دینے میں آسانی ہو، کیوں کہ بعض اوقات ایک حدیث جو دوسری سے مفہوم میں مختلف ہو اگر اس کو کسی دوسری جگہ پر درج کیا جائے تو وہ نظر سے اوجھل رہ جاتی ہے) اب جس کو عربی زبان آتی ہو۔ اس کے لیے عمل بالحدیث کو چھوڑ کر کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنے کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہا۔

ابوداوٗد کا مقصد تصنیف:

(3) ابوداوٗد سجستانی۔ سنن ابی داوٗد تالیف کرنے سے ان کا مقصد یہ تھا کہ جن حدیثوں سے مختلف بلاد واقطار کے فقہاء مجتہدین نے استدلال کیا ہے اور اپنے اپنے مذاہب کی بنا ان حدیثوں پر رکھی ہے۔ ان سب کو ایک ہی کتاب میں جمع کر دیا جائے۔ ان کی اس تصنیف میں صحیح اور حسن اور لین صالح (قابل استناد) ہر قسم کی حدیثیں موجود ہیں۔ ناقابل استناد حدیثوں سے حتی الامکان احتراز کیا ہے۔ اگر کوئی ضعیف یا معلول حدیث درج کی بھی ہے تو اس کے ضعف کی تصریح کر دی ہے اور علت قادحہ کو نفس کتاب میں لکھ دیا ہے۔ ابوداوٗدؒ کا اپنا قول ہے کہ: ''میں نے اس

کتاب میں کوئی ایسی حدیث نہیں لکھی ہے جس کو سب اہل علم نے ناقابل عمل سمجھا ہو۔ بالفاظ دیگر اس پر عمل نہ کیا ہو۔" ہر ایک حدیث سے جو حکم شرعی کسی عالم اور فقیہہ مجتہد نے استنباط کیا ہے۔ اس کو اس حدیث کا عنوان قرار دیا ہے۔ (اس سے کتاب مذکور نہایت عام فہم ہو گئی ہے) امام غزالی اور دیگر علمائے عظام نے تصریح کی ہے کہ ان کی یہ کتاب مجتہد کے لیے کافی ہے۔ (کیوں کہ عمل بالحدیث کا پورا ذخیرہ اس میں موجود اور محفوظ ہے)۔

جامع ترمذی کی خصوصیات:

(4) ابوعیسیٰ ترمذیؒ۔ انہوں نے شیخین (بخاری اور مسلم) اور ابوداؤدؒ دونوں کے طریقوں کو مستحسن سمجھا۔ مثلاً شیخین کا یہ اصول ہے کہ وہ کسی حدیث کے متعلق ابہام کو نہیں رہنے دیتے اور ابوداؤدؒ نے کوئی ایسی صحیح اور قابل استناد حدیث نہیں چھوڑی جس سے کسی فقیہہ مجتہد نے بھی استدلال اور استنباط کیا ہے۔ سب کو اپنی کتاب میں جمع کر دیا ہے۔ چنانچہ ابوعیسیٰؒ ترمذی نے جب جامع ترمذی تصنیف کرنے کا ارادہ کیا تو انہوں نے ان دونوں طریقوں کی پابندی کرنا اپنا اصول قرار دیا۔ اس پر حدیث کے متعلق بالتفصیل بیان کیا۔ اس لیے ان کی یہ تصنیف جامع ترمذی کی صورت پر مرتب ہوئی۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے مختلف طرق حدیث کو نہایت مختصر طریقہ پر بیان کیا۔ کسی حدیث کے ایک اسناد کو (جو اس کو معتبر یا مشہور نظر آیا) لکھ کر باقی فقط کا اشارہ کردیا۔ کہ فلاں فلاں صحابی سے بھی یہ حدیث منقول ہے۔ ان کے علاوہ اس نے ہر ایک حدیث کی نوعیت بھی بتا دی ہے کہ حدیث صحیح ہے یا حسن یا ضعیف یا منکر وغیرہ۔ پھر اگر کوئی حدیث ضعیف یا غریب یا معلول ہے تو اس کے ضعف یا غرابت کی وجہ بھی بیان کردی اور معلول میں علت قادحہ کی تصریح کی ہے تا کہ اس کے مطالعہ کرنے والوں کو ہر طرح کی سہولت بہم پہنچائی جائے اور ہر ایک حدیث کے متعلق ان کو کامل بصیرت ہو۔ اسی طرح اگر روایت میں کسی کے نام یا رکنیت کے متعلق کچھ ابہام سا ہوتا ہے تو اس کو رفع کر دیتا ہے۔ الغرض اس نے اہل علم کے لیے احادیث (نبوی) صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کسی قسم کا اشتباہ باقی نہیں چھوڑا۔ اسی بناء پر بعض علماء کا قول ہے۔ کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جو مجتہد کے لیے بھی کافی ہے اور مقلد کو بھی دوسری تصانیف سے بے نیاز کر دیتی ہے۔

رفع یدین کے متعلق شاہ صاحبؒ کی رائے:

جب سورۃ فاتحہ اور کوئی دوسری سورت پڑھی جا چکے اور آدمی رکوع کرنے لگے تو تکبیر کہتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو کندھوں یا کانوں تک اٹھائے۔ اسی طرح جب رکوع سے سر اٹھائے تب بھی رفع یدین کرے لیکن سجدہ میں رفع یدین نہیں۔

اس کا فلسفہ یہ ہے کہ رفع یدین ایک تعظیمی فعل ہے' اس سے نفس کو تنبیہہ ہوتی ہے کہ آدمی تمام دنیاوی اشغال کو چھوڑ کر خدائے پاک کے ساتھ ہم کلامی (مناجات) میں مشغول ہو۔ اس لیے ہر سہ افعال تعظیمہ (قیام' رکوع اور سجود) کے آغاز پر رفع یدین مشروع ہوا تاکہ ان میں سے ہر ایک رکن تعظیمی کے آغاز پر نفس کو اس حقیقت پر متوجہ کیا جائے اور ہر ایک فعل کی ابتداء میں ازسرنو اس میں بیداری اور احساس پیدا ہو اور وہ اپنے افعال کے حقائق اور ان کے ثمرات کو پیش نظر رکھنے سے غافل نہ ہو۔ رفع یدین ان ہیآت مستحبہ میں سے ہے جن کو کبھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عمل میں لائے ہیں اور کبھی ان کو ترک کیا ہے۔ چنانچہ اس کا فعل اور ترک دونوں سنت ہیں اور ہر ایک پر صحابہ اور تابعین اور دیگر علماء مجتہدین کی ایک جماعت نے عمل کیا ہے۔

یہ مسئلہ منجملہ ان مسائل عدیدہ کے ہے جس میں اہل مدینہ اور اہل کوفہ کے علماء نے اختلاف کیا ہے اور ان میں سے ہر ایک کے پاس اپنے قول کی تائید میں مستحکم دلیل ہے۔ میرے نزدیک اس قسم کے مسائل میں صحیح بات یہ ہے کہ دونوں باتیں سنت ہیں۔ اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ وتر کی ایک رکعت یا تین رکعت پڑھنا دونوں ثابت ہیں۔

بایں ہمہ رفع یدین کرنا میرے نزدیک اس کے نہ کرنے سے بہتر ہے کیونکہ رفع کی احادیث بہت زیادہ اور مستند تر ہیں لیکن (میری رائے یہ ہے کہ) آدمی کے لیے یہ مناسب نہیں کہ اس قسم کے اختلافی مسائل میں کوئی ایسا پہلو اختیار کرے جس سے اہل بلد کے عوام میں ایک ہنگامہ برپا ہو جائے۔* چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں یہی اشارہ ہے جس میں آپؐ نے بی بی عائشہؓ کو مخاطب کر کے فرمایا ہے:

''اگر تمہاری قوم نئی نئی ایمان نہ لائی ہوتی (لفظی: کفر کے نزدیک نہ ہوتی) تو میں کعبہ کو ڈھا کر اس کو ازسرنو ابراہیمی نقشہ کے مطابق تعمیر کرتا۔''

اور بہت ممکن ہے کہ ابن مسعودؓ کو یہ غلط فہمی ہوئی ہو کہ (اگرچہ رفع اور عدم رفع دونوں سنت ہیں تاہم) آپؐ کا آخری عمل رفع نہ کرنا تھا۔ کیوں کہ یہ نظر یہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ کر چکے تھے کہ نماز کی بنا اعضا کے سکون پر ہے۔ لیکن یہ نکتہ ان کی نظر سے اوجھل رہا کہ رفع یدین ایک فعل تعظیمی ہے اور یہی وجہ ہے کہ نماز کے آغاز پر اس کا عمل میں لانا سب کے نزدیک بالاتفاق سنت ہے' یا ممکن ہے ان کا یہ خیال ہو کہ رفع یدین میں ترک کا اشارہ پایا جاتا ہے اس لیے نماز کے دوران میں اس کا عمل میں لانا مناسب نہیں۔ لیکن یہ بات شاید ان کی سمجھ میں نہ آئی کہ ترک ماسوائے اللہ کے اشارہ کو بار بار دہرانا اور ہر ایک فعل تعظیمی کی ابتداء اسی سے کرنا نماز کے اصول مطلوبہ میں سے ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اسی رفع یدین کی حدیث میں ہے کہ:

''سجدہ میں آپؐ ایسا نہیں کرتے تھے۔''

میں کہتا ہوں۔ قومہ کی تشریح اس لیے ہوئی ہے کہ رکوع اور سجدہ کا الگ الگ مستقل رکن ہونا نمایاں طور پر معلوم ہو' اس لیے قومہ کے ساتھ رفع کرنا سجدہ ہی کے لیے رفع کرنا ہے۔ بنابرآں رفع دہرانے کے کوئی معنے نہیں۔

* سلفی/اہل حدیث کو چاہیے کہ پیار سے سمجھائیں۔ اور احناف کو چاہیے کہ رفع الیدین والوں کو خوش دلی سے قبول فرمائیں۔